نواں سفر ۔ رامپور سے امروہہ

ابھی گنگا کے اُوس پار والی شادی کی یادیں تازہ تھیں کہ ایک اور تقریب میں شرکت کی دعوت آ گئی۔ یہ دعوت آئی تھی امروہہ سے جو ہماری سسرال کا علاقہ تھا اور یہاں حسن پور کے قریب ہمارے سسر کے حصّے کی کئی ہزار ایکڑ زمین تھی جس کی دیکھ بھال اُن کے بڑے بھائی تحصیل دار ممتاز حسن اور سسر کی پہلی بیوی سے ہونے والے بڑے صاحبزادے کرتے تھے۔ ساری آمدنی ہمارے سسر کو رامپور میں مل جاتی تھی۔ ہمارے شوہر اور ہمارے جیٹھ کو کبھی بھی اس زمینداری سے شوق نہیں رہا۔ جب تقسیمِ ہندوستان ہوئی تو یہ دونوں بھائی اور اُن کی اکلوتی بہن تو پاکستان آ گئے اور ان کے حصے کی زمین بھی اُن کے چچا زاد بھائیوں کو مل گئی۔ کئی سال بعد ہندوستان کی اس وقت کی سوشلسٹ حکومت کے قانون کے مطابق اس میں سے بھی تقریباً ساری زمین وہاں کے کاشتکاروں میں تقسیم ہو گئی اور ان لوگوں کے پاس برائے نام زمین بچی رہ گئی۔

رامپور سے امروہہ جانے کے لئے ریل گاڑی مرادآباد سے بدلنا ہوتی تھی۔ ہم مرادآباد کے ریلوے اسٹیشن کے انتظار گھر میں بیٹھے امروہہ کی ٹرین کا انتظار کر رہے تھے کہ ایک اور خاندان بھی وہیں آ گیا۔ بڑے سامان کے ساتھ لدی پھندی، ساتھ میں ٹوکرے کے ٹوکرے لئے ہوئے، جس میں سے بڑی خوشبو آ رہی تھی۔ ہمارے پوچھنے پر بتایا کہ،''بس بڑی دور سے آ رہے ہیں اور بڑی دور جا رہے ہیں''۔ انہوں نے پھر جلدی جلدی اپنے ٹوکروں میں سے خورمے نکالے اور خوب کھا پی کر بآوازِ بلند خرّاٹوں کے ساتھ سونے لگے۔ اب ہمارے ساتھ کچھ اور بھی خواتین تھیں جو کہنے لگیں،'' عجیب انسان ہیں، ہمیں کھانے کو پوچھا بھی نہیں، اور

اب یہ ان کھانوں کی اتنی اچھی خوشبو بھی ہم پر نچھاور کر رہی ہیں''۔ایک اور خاتون بولیں،''چلو دیکھ لیں کہ ہے کیا''۔ہم ایک دم خاموش سے ہو گئے۔ پھر ہم نے کہا کہ''ہمارے والد تو منع کرتے ہیں کہ اگر کسی کا کھانا اس کے پوچھے بغیر کھالیں تو نماز قبول نہیں ہوتی''۔اس پر وہ خاتون بولیں،''ہمارے والد نے ایسا کچھ نہیں کہا،اور پھر جب نماز ہی نہیں پڑھنا تو اس کے قبول نہ ہونے کا کیا ڈر؟ چلو تم مت کھانا''۔ یہ کہہ کر انہوں نے اور دوسری دو خواتین نے ان ٹوکروں میں کے ہر ایک ٹوکرے سے مٹھائی کا ایک بڑا ٹکڑا نکالا، اپنے ہاتھوں سے کاغذ کا ایک دونا بنا کر اس میں رکھا اور مزے لے لے کر کھانے لگیں۔''دونا'' دراصل ایک پیالہ نما برتن کو کہتے ہیں جو پتوں سے بنایا جاتا تھا، یہ پتّے درخت یا بیلوں کے تنکوں سے جوڑے ہوئے ہوتے تھے۔کھانے کے ساتھ ساتھ یہ خواتین مٹھائی کی تعریف بھی کرتی رہیں۔ بھاری خراٹوں میں ٹوکروں کے اوپر بندھے ہوئے کاغذ کھلنے کی آواز بھی گھٹ گئی تھی اور سونے والوں کو نہیں سنائی دی۔اتنے میں ریل گاڑی کے آنے کا وقت ہو گیا اور اس خاندان کے مردوں نے آ کر انہیں اٹھایا۔اب یہ اٹھیں تو کھانے والی خواتین نے اُن کو انہی کی مٹھائی دی اور کہا،''ارے تم بھوکی ہوگی، ذرا یہ بھی چکھو''۔ان لوگوں نے یہ مٹھائی چکھی اور بہت تعریف کی کہ اچھی بنی ہوئی ہے۔ہم تو ڈر کے وہاں سے ہٹ ہی گئے کہ شاید تیزم تاز ہو جانے کا اِمکان تھا۔لیکن وہ لوگ اپنی ریل گاڑی میں چلے گئے اور ہم اپنی ریل گاڑی میں۔مراد آباد سے امروہہ تقریباً ۳۵؍میل دور ہے لیکن اِس چھکڑا ریل گاڑی سے کوئی دو گھنٹہ میں امروہہ کے اسٹیشن پہنچے۔اس سے پہلے اپنے دولہا بھائی کے ساتھ نوگاؤں جاتے وقت امروہہ کا صرف ریلوے اسٹیشن دیکھا تھا۔اس کو دس سال گزر چکے تھے۔اب یہاں پہلے کی نسبت تھوڑی ترقی نظر آئی۔ بیل گاڑیاں کم اور رکشا زیادہ تھے۔سڑکیں پکّی تھیں، اور نئی نئی عمارتیں بھی نظر آ رہی تھیں۔

ہمیں لینے کچھ رشتہ دار اسٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔گھر پہنچے تو پورے خاندان سے ملاقات ہوئی۔ کئی لڑکیاں اپنی ہم عمر بھی مل گئیں۔ یہاں بھی پردہ ایسا ہی تھا کہ عورتیں برقعہ اوڑھ کر باہر کے کام کاج کے لئے اکیلے ہی گھر سے نکل سکتی تھیں۔ ویسے بھی آزادی کے بعد حالات بہت تیزی سے بدل رہے تھے اور سب لڑکیاں اسکول اور کالج جانے لگی تھیں۔یہیں پر ذاکر صاحب کے دادا کے بنائے ہوئے اسکول اور کالج بھی تھے۔لڑکیوں کے لئے میٹرک تک کا اسکول تھا جو کہ حویلیوں کے درمیان ہی تھا اور اس لئے لڑکیاں محلّے سے باہر نکلے بغیر اندرونی راستوں سے ہوتی ہوئی اسکول چلی جاتی تھیں۔

امروہہ میں تعلیم کا بہت زور نظر آیا۔ اکثر نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسرے شہروں میں جاتے تھے۔ یہ نوجوان صبح ہی صبح سائیکلوں پر امروہہ سے مرادآباد کے کالجوں میں جاتے تھے، اور شام تک واپس آتے تھے۔ آجکل ہلکی سائیکلیں بھی مضبوط ہوتی ہیں اور کچھ میں تو گراریاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن اُن دنوں تو وہی ریلے اور ہرکولیس سائکلیں تھیں جو تھیں تو بہت مضبوط لیکن اتنی ہی بھاری بھی ہوتی تھیں۔ اس محنت سے لگتا تھا کہ ان لوگوں کو تعلیم سے بہت رغبت تھی۔

امروہہ میں ہم اِن چار دنوں میں کچھ نہیں دیکھ پائے۔ سوائے اس کے کہ اپنی سسرال والوں سے ملے، خوشی ہوئی، اور پھر واپس رامپور آ گئے۔

دسواں سفر - چلو پاکستان چلیں، رَتھ سے ہوائی جہاز

رامپور میں مسلمانوں کی آبادی ۸۰/ فیصد تھی۔ اس کے شمال مغرب میں امروہہ، نوگاؤں، میرٹھ، دہلی اور علی گڑھ وغیرہ سب ہی مسلمانوں سے بھرے ہوئے تھے، لیکن ان میں سے کسی جغرافیائی حصّہ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ پاکستان سے مل سکیں۔ مسلمانوں کی آبادی چھدری چھدری سی تھی، پھر بیچ میں سکھ پنجاب تھا۔ مسلم لیگ اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اگر ہندوستان کی تقسیم مسلمانوں اور ہندوؤں کی نسبتاً آبادی کے حساب سے کرتے تو مسلمانوں کو زیادہ اور صحیح مناسبت سے زمینی حصہ ملتا۔ لیکن غالبًا اس وقت کی سیاسی حالات اس کی اجازت نہ دے سکے ہوں۔ اِن تمام باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے نواب رامپور نے اپنی جانب سے صحیح فیصلہ کیا کہ ریاست رامپور کو ہندوستان میں ضم کر دیا جائے۔ اس فیصلہ سے نواب کو بذاتِ خود بہت فوائد ہوئے، مالی بھی اور سیاسی بھی۔ کچھ فائدہ رامپور کے مسلمانوں کو بھی ہوا، اس طرح کے وہاں وہ قتل و غارت نہیں ہوا جو دہلی میں ہوا۔ دوسری طرف کیونکہ عوام مسلم لیگی تھے، اور اکثریت سُنّیوں کی تھی، رامپور میں فسادات ہوئے۔ سنّیوں نے شیعوں کے گھر جلائے، گو کہ جانی نقصان بہت کم ہوا اور وہ بھی عالمِ غصّہ میں نہ کہ منصوبہ بندی کے ساتھ۔

پاکستان بننے کے لئے ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق بہت کام کیا، لیکن پاکستان بننے سے ہمیں بہت زیادہ نقصانات ہوئے۔ ایک طرف تو نواب نے برٹش انڈین آرمی ختم ہونے کے بعد اپنی فوج بھی ختم کر دی کہ یہ برٹش انڈین آرمی کا ہی حصّہ تھی، اور پھر جب ریاست نہیں تو آرمی کہاں۔ ہندوستانی ملٹری نے ذاکر صاحب کے لئے ۱۵۰/ روپیہ مہینہ پنشن مقرر کر دی جبکہ وہ ابھی بمشکل ۳۱/ سال کے تھے، اور فوج ختم

ہونے سے پہلے ۷۵۰/روپیہ مہینہ لے رہے تھے۔نواب ہندوستانی حکومت سے پنشن کا معاہدہ کر کے اپنے آپ کو بری الذمّہ تصّور کرنے لگے۔اس کے علاوہ اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

اس زمانے میں حیدرآباد کی ریاست آزاد رہنے کے لئے ہندوستان سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو گئی تو ہمارے شوہر مسلمانی جذبہ رکھتے ہوئے رامپوری فوج کے بہت سے افراد کے ساتھ حیدرآباد پہنچ گئے۔دو ڈھائی مہینے کے بعد،ستمبر ۱۹۴۸ء میں انگریزی اسلحہ اور انگریزی حمایت کے ساتھ ہندوستانی فوج نے حیدرآباد پر قبضہ کرلیا تو تمام فوجی واپس آ گئے۔حالات انتہائی خراب تھے۔ابھی جنگِ عظیم ختم ہوئی تھی اور پھر یہ آزادی کا بڑا امتحان آ پڑا۔ذاکر صاحب آس پاس کے بڑے شہروں میں اپنے دوستوں سے ملے کہ کچھ کاروبار کیا جائے یا کوئی نئی ملازمت تلاش کی جائے۔لیکن سب ہی پاکستان جا رہے تھے اور کچھ براہِ راست برطانیہ روانہ ہو رہے تھے۔مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں رہنے کے راستے بند ہو رہے تھے،اور ہندو مسلم اختلافات اور فسادات بڑھتے جا رہے تھے۔

ذاکر صاحب نے دہلی اور بریلی میں کچھ وقت گزارا تا کہ وہاں کی صورتحال کا اندازہ ہو سکے۔ رامپور میں تو اتنی پریشانیاں نہیں تھیں،لیکن ان شہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ کم از کم مستقبلِ قریب میں مسلمانوں کے لئے ملازمتوں اور تجارتی شعبہ میں مشکلات کے بڑھنے کا صد فی صد امکان تھا۔کافی سوچ بچار کے بعد ہمارے شوہر نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان چلے جائیں۔اب پنجاب کی طرف سے جانا خطرناک تھا۔ادھر تو اکثر ٹرینیں لاشوں سے پٹی ہوئی جا رہی تھیں۔یہ طے پایا کہ منیبا،کھوکھرا پار اور میر پور خاص سندھ کے راستے سے جایا جائے۔وہاں خطرات کم تھے۔آخر ایک دن ہمارے شوہر نے ہم سب کو خدا حافظ کہا اور پاکستان کی جانب روانہ ہو گئے۔دو مہینہ کراچی میں انہوں نے ایک درمیانی سی کمپنی میں کام کیا اور پھر انہیں پاکستان کی فوج میں کمیشن مل گیا تو وہ راولپنڈی آ گئے۔کئی ماہ بعد جب صورتِ حال سازگار ہوئی تو انہوں نے ہمیں پاکستان بلانے کا انتظام کیا۔اکیلی عورت کے لئے ہندوستان میں پنجاب سے گزرنا اس وقت بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔اِس وجہ سے ہمارے شوہر نے تاکید کی تھی کہ ہم دہلی تک ریل گاڑی سے جائیں،اور وہاں سے ہوائی جہاز میں لاہور آ جائیں۔

اس مرتبہ راولپنڈی جانے میں پہلی مرتبہ کے سفر والی بات نہیں تھی۔اپنے بھرے گھر کا سامان ہم

ایسے ہی تحفۃً بٹوارا کر کے آ گئے۔ سامان بیچتے تو لوگ کہتے کہ ارے دیکھو، اتنے بڑے گھر کے لوگ سامان بیچ رہے ہیں۔ ہمارے والدین، بہن، اور سہیلیوں کو علم تھا کہ اب ہم دوسرے ملک جا رہے تھے۔ سارے عزیز و اقارب ہم کو وداع کرنے کے لئے ہمارے سسر کے گھر جمع تھے۔ محلّے والے بھی پریشان تھے۔ جب ہم گھر سے روانہ ہوئے تو ہر شخص دہاڑیں مار مار کے رو رہا تھا۔ ہمارے والد اور ہمارے شیر علی ماموں ہمیں چھوڑنے دہلی تک آئے۔ وہاں ہم سب نے دو روز قیام کیا۔ دہلی بھی وہ دہلی نہیں لگ رہا تھا جو ہم نے ۱۹۴۵ء میں دیکھا تھا۔ ہم دہلی میں ببّا کے ایک جاننے والے صاحب کے گھر رکے۔ وہ گھر پالم ایئر پورٹ کے پاس تھا۔ اس گھر کے ساتھ ایک میدان تھا جس کے چاروں طرف خاردار تار کھینچ کر ایک باڑھ لگا کر ایک پناہ گاہ بنائی ہوئی تھی۔ یہاں وہ خواتین رکھی گئی تھیں جو ہنگاموں کے دوران اپنے خاندان سے بچھڑ گئی تھیں یا جن کے مرد شہید کر دیئے گئے تھے۔ ریڈیو سے سارا دن ان کے نام اور ان کے خاندانی سابقہ پتوں کا اِعلان ہوتا رہتا تھا۔ کتنی ہی خواتین کی بے حرمتی ہو چکی تھی اور اُن کے اپنے خاندانوں نے انہیں واپس لینے سے انکار کر دیا تھا۔ ساری رات رونے چلّانے کی آواز آتی رہیں۔ یہ آوازیں دل کے پار ہو جاتیں اور ان دنوں ہم سب کی بھوک ختم ہو گئی تھی۔ جیسے تیسے کر کے یہ دو دن گزرے اور ہماری پرواز کا دن آ گیا۔ ہوائی جہاز سے ہمارا یہ پہلا سفر تھا۔

دہلی کے پالم ایئر پورٹ پہنچے، جانچ پڑتال ہوئی۔ ایک کمرے سے دوسرے کمرے جاتے رہے۔ نہ جانے کتنے کاغذات پر کتنی مہریں۔ ابھی پاسپورٹ نہیں شروع ہوئے تھے اور پرمٹ پر سفر ہو سکتا تھا۔ ایک کمرہ کے دروازے پر ایک سپاہی نے ہمارے ببّا اور ماموں سے کہا کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہہ دیں کیونکہ وہاں سے آگے صرف مسافر جا سکتے تھے۔ اب اندر گئے تو سامان کی دوبارہ تلاشی شروع ہو گئی۔ سامان بھی تولا گیا اور وہ وزن میں ہمارے الاؤنس سے کچھ زیادہ نکلا۔ ہمارے سامان میں تین ٹرنک اور ایک بیگ تھا۔ اس بیگ میں ہمارے والدین کی طرف سے ہمیں جہیز میں دیا ہوا زیور، کچھ نگینے اور پکھراج کے کچھ دانے تھے۔ کسٹمز آفیسر نے رام رام کرتے ہوئے ہم سے کہا کہ ''اتنا زیور لے جانے کی اجازت نہیں، ایک سیٹ لے جا سکیں گے اور باقی سب وہیں چھوڑنا ہوگا''۔ اب ہم نے اسُے لاکھ سمجھایا کہ ہم ہمیشہ کے لئے پاکستان جا رہے تھے اور ہمیں اپنی تمام چیزیں لے جانے کا حق تھا، مگر وہ نہ مانا۔ اس نے ہمیں ایک جوڑا دے دیا اور باقی سارا زیور رکھ لیا۔ ہمیں ایک گلے سڑے کاغذ کی ایک چندھی پر رسید بنا دی جس پر نہ مہر اور نہ کچھ اتا پتا۔ بس انگریزی میں کچھ لکیریں کھچی ہوئی تھیں۔ ببا اور ماموں بھی باہر رہ گئے تھے اور جہاز کی روانگی کا اعلان پر اعلان ہو رہا تھا۔

ہمیں لگ رہا تھا کہ ہمارے سارے زیورات پر وہ کسٹمز آفیسر دن دہاڑے ڈاکہ مار رہا تھا اور ہم بالکل کچھ نہ کر سکتے تھے۔ غرض ہم سب کچھ وہیں چھوڑ کر جہاز میں سوار ہو گئے۔ یہ ایئر انڈیا کا ایک ڈکوٹا DC3 ہوائی جہاز تھا۔ نیچی سی چھت، اور اندر چڑھنے کے بعد اپنی نشست پر پہنچنے کے لئے ایسا لگا جیسے کہ ہم چڑھائی چڑھ رہے ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں جہاز نے کچھ زمین پر دوڑ کر ہوا میں پرواز کی اور دہلی کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پاکستان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ساتھ ہی ہماری یادیں، ہمارا خاندان اور دوست، سہیلیاں اور نہ جانے کیا کیا پیچھے رہ گیا کہ مقابلتاً اس کسٹمز آفیسر کے پاس تو ہم نے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔

دہلی سے لاہور: ایئر انڈیا کا DC-3۔ زمین پر برساتی کیڑا، فضا میں اپنے زمانے کا ستارہ

ٹاٹا ایئر لائنز ختم ہو رہی تھی اور ایئر انڈیا زیادہ نمایاں ہو رہی تھی، پھر بھی جہاز پر کچھ اتنا معقول انتظام نہیں تھا۔ کھانے کا وقت بھی نہیں تھا کہ کھانا ملتا۔ دہلی سے لاہور کا راستہ تقریباً ۳۰۰ رمیل تھا اور اس دو پنکھوں والے ہوائی جہاز نے بھی اس فاصلہ کو ڈیڑھ گھنٹے سے کم میں طے کر لیا تھا۔ بہرحال جہاز پر کھانے میں کچھ بھی نہیں ملا، اور نہ پینے کو۔ ابھی اس کی پرواز شروع ہی ہوئی تھی اور ہم نے آرام سے بیٹھنا چاہا تھا کہ اعلان ہو گیا کہ اب جہاز اترنے والا ہے لہذا ہمیں نشست کی پیٹی دوبارہ باندھنا واجب تھا۔ لاہور کے ہوائی اڈہ پر اُترے، مئی کا مہینہ تھا اور گرمی سے پیاس ستا رہی تھی۔ پانی کہیں ملتا نہ تھا، نہ ہی پانی کی سبیل یا فاؤنٹین۔ ہر جگہ مختلف کولا کی بوتلیں چار یا پانچ گنا قیمت پر مل رہی تھیں۔ ویسے بھی پیاس کے لئے پانی چاہیئے تھا اور ہم کولا پینے کو تیار نہ تھے۔ بہرکیف ہمارے ذاکر صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ بھی خوش اور ہم بھی کچھ دیر کو اپنے تمام نقصانات بھول گئے۔

غرض مئی کے اِس مہینے کی گرمی برداشت کرتے ہوئے ہم لاہور کے ہوائی اڈہ سے ریلوے اسٹیشن کے لئے چلے۔ مال روڈ تک تو حالات صحیح نظر آئے لیکن جب مال روڈ کو چھوڑ کر ہم دوسری سڑکوں پر آئے اور ایبٹ روڈ اور میکلوڈ روڈ سے گزرے تو راستے بھر جلی ہوئی عمارتیں نظر آئیں۔ سڑک کے کنارے جلی ہوئی

کاریں اور جلے ہوئے سائیکل رکشا پڑے تھے۔ کچھ پیسے کی کمی تھی اور کچھ اس قوم میں عزم کی کمی تھی کہ فسادات ختم ہوئے کئی سال گزر چکے تھے لیکن لوگوں نے اِن چیزوں کی بھی صفائی نہیں کی تھی۔ الٹا یہ لوگ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ تانگے والے ہندوستان سے آنے والوں مسافروں سے ایک آنے کی جگہ آٹھ آنے مانگتے تھے، اور ایک روٹی یا ایک پُوری جو دو پیسے کی ہوتی تھی، ان لوگوں نے پندرہ پندرہ روپے میں بیچی۔ کہا جاتا ہے کہ پُوت کے پیر پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔ اس راہزنی سے اور ان جلی ہوئی عمارتوں سے ہمیں اندازہ ہو جانا چاہیئے تھا کہ یہ قوم آگے کیا کرے گی، لیکن اس وقت ہمارے دل میں صرف پاکستان کے لئے جذبہ تھا اور ہم یہی جذبہ سامنے رکھتے ہوئے ان چیزوں سے اپنی توجہ ہٹانے میں کامیاب رہے۔

اسٹیشن سے ہم نے راولپنڈی کے لئے ٹرین لی، اور برتھ پر لیٹ کر کچھ آرام کیا۔ لاہور سے تقریباً ۲۷۵ رکلومیٹر کا سفر کر کے راولپنڈی پہنچے۔ پھر تانگہ کر کے اپنے بنگلہ میں پہنچے۔ ذاکر صاحب اس وقت پاکستانی فوج میں تقریباً ایک سال سے تھے اور انہیں اب یہ بنگلہ ملا تھا۔ یہ خود ان تمام چیزوں کے منتظم تھے۔ فوج کے اندر کے تمام شہری کام جن میں افواج کی شہری ضروریات کی لاجسٹکس بھی آتی تھی، ہمارے شوہر کے محکمے کے تحت آتی تھیں۔ یہ پاکستانی فوج کی فرسٹ پنجاب رجمنٹ میں SSO-II تھے اور کنٹونمنٹ کے علاقوں کی بجلی، پانی، بنگلوں کی الاٹمنٹ وغیرہ ان کے ذمہ تھی۔ لیکن انہوں نے اس اختیار سے فائدہ نہ اٹھایا، کہ یہ اسی طرح کے اصول پسند انسان تھے۔ فوج میں جنگ کے زمانے میں جنگ، اور امن کے زمانے میں فوجی شہریوں جیسے کام اسی طرح کرتے تھے۔ کچھ انجینیرنگ میں ہوتے تو کچھ سڑکیں بناتے۔ فوجی مشقیں سب کرتے تھے، ایک منصوبہ کے مطابق۔ مگر یہ اُس وقت کی باتیں تھیں ورنہ اب تو پاکستانی فوج قوم کے لئے کوئی کام نہیں کرتی اور دوسری طرف شہری کاموں کے بڑے ٹھیکے بھی اب فوج کے پاس ہی جاتے ہیں۔ اب ہمیں امریکہ کے نیشنل گارڈز کا انتظام اچھا اور قیمتاً مناسب لگتا ہے۔ امریکی حکومت اپنے شہریوں کو فوجی معیار پر تیار رکھنے کے لئے شہری کام کے دوران گاہے بگاہے فوجی مشقیں کرواتی ہے۔ دوسری طرف امریکی فوجیوں کو فوجی مشق کرنے کے بعد عام شہری کے مفاد اور فلاحی کاموں میں مشغول رکھا جاتا ہے۔

ہندوستان کی فوج سے بہت لوگ آئے اور انہوں نے پاکستان کی فوج میں دوبارہ کمیشن لیا۔ ان میں جنہیں ہم جانتے ہیں ان میں جنرل سرفراز، جنرل ناصر، جنرل شیر علی، کرنل سعید قادر، کرنل شاہد حامد، کرنل

محمود اور کرنل خوشنود شامل ہیں۔ ان میں سے ہوسکتا ہے کہ کچھ افسران کے رتبے بعد میں بڑھ گئے ہوں۔ کافی جان پہچان کے دوسرے لوگ بھی مل گئے جن میں کوہاٹ کے یعقوب خان بھی شامل تھے۔ اس مرتبہ کیونکہ ہم یہاں مستقل رہنے کے لئے آئے تھے کہ بفضلِ خدا اپنے وطن آ گئے تھے، لہذا اب ان سب سے مل کر اور زیادہ خوشی ہوئی اور یہ لوگ اب اپنے لگنے لگے۔

راولپنڈی میں ہمارا تین بیڈروم کا بنگلہ کنٹونمنٹ کے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (CMH) کے بڑے دروازے کے سامنے یونیک روڈ (Unike Road) پر واقع تھا۔ یہی سڑک صدر سے کنٹونمنٹ آتی تھی اور پھر آگے لال کرتی چلی جاتی تھی جہاں ایک بہت بڑا بازار اور سنیما ہال تھا۔ حکومت کے پاس ذرائع کی بہت کمی تھی، اتنی کہ کنٹونمنٹ میں بھی پانی کا راشن تھا، اور کبھی عید کے دن بھی پانی نہیں آتا تھا۔ کچن کے باہر سبزیوں اور ترکاریوں کو دھونے کے لئے حوضیاں بنی ہوئی تھیں جن میں پانی جمع ہو جاتا تو مالی وہی پانی لان اور پھولوں کے پودوں میں دیتا۔ گھر میں بجلی، پانی اور آتشدان کا انتظام تھا، لیکن اجابت کے لئے فلش وغیرہ نہیں تھے بلکہ لکڑی کے کرسی نما کموڈ تھے۔ کچھ ہی دنوں بعد ہم نے گلاب اور دوسرے پھولوں کے پودے لگائے، اور کچھ ٹماٹر اور دوسرے پھل اور سبزیاں بھی لگائیں۔ اب یہ بنگلہ گھر لگنے لگا۔

غرض یہ کہ نہ کوئی کاغذی کاروائیاں نہ ہی جج کے سامنے پیشی۔ اب ہم پاکستان میں تھے اور پاکستانی تھے۔

گیارہواں سفر ۔ راولپنڈی

پنڈی آنے کے بعد زبان کا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ بہت سے لوگ اردو جانتے تھے اور کچھ بولتے بھی تھے۔ ابھی پاکستان نیا نیا بنا تھا اور اردو اب مستحکم ہو رہی تھی۔ لیکن آفیسرز کے میس میں ہمیں کچھ فرق محسوس ہوتا تھا۔ ہمارے شوہر کا محکمہ اور اُن کی پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ آرمی کے افسروں کی رہائش، پانی، بجلی، اور تمام جشنوں کا انتظام ان کا محکمہ کرتا تھا۔ اِس وجہ سے بھی ہر بڑا اور چھوٹا افسر ہم سے اور ذاکر صاحب سے کچھ زیادہ ہی پرجوشی سے ملتا تھا۔ ہمیں اس کا پتہ تھا کہ ان عام سی ذمّہ داریوں کے علاوہ ہمارے شوہر کے پاس کچھ مزید ایسی ذمّہ داریاں بھی تھیں جن کے بارے میں ہمیں علم نہیں تھا۔ ذاکر صاحب اور کچھ دوسرے افسران فوج کی طرف سے راولپنڈی سے تقریباً ستر میل دور، آزاد کشمیر کی تحصیل راوٗلہ کوٹ میں تعینات رہتے اور ایک مہینہ میں صرف ایک ہفتہ گھر میں گزارتے تھے۔ غرض پنجابی زبان سے ناواقفیت اور شوہر کے گھر سے دور رہنے کے باعث راولپنڈی میں لوگوں سے میل جول بڑھانے میں کافی روکاوٹ رہی۔

آزادی کے بعد حالات مستقلاً ہنگامی تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ۲۷/اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ایک ٹیلیگرام کے ذریعے خصوصی طور پر لیاقت علی خاں کو یقین دہانی کرائی تھی کہ ہندوستان کشمیری عوام کی رائے کے مطابق فیصلہ کو تسلیم کرے گا۔ بعد میں ولبھ بھائی پٹیل اور خود نہرو اس سے منکر ہوئے اور ہندوستان اور پاکستان کی پہلی جنگ ۱۹۴۸ء ہی میں شروع ہوگئی۔ ادھر ۳۰/جنوری ۱۹۴۸ء کو مہاتما موہن داس گاندھی کو ایک ہندو نوجوان نے دہلی میں ہلاک کر دیا، اور ۱۵/دسمبر ۱۹۵۰ء کو ولبھ بھائی پٹیل بھی ختم ہوگئے۔ ۱۶/اکتوبر

۱۹۵۱ء کو لیاقت علی خان کی شہادت راولپنڈی کنٹونمنٹ میں ۲۰،۰۰۰ افراد کے مجمع میں ہزارہ کے سیّد اکبر کے ہاتھوں ہوگئی تھی۔ سیّد اکبر کو وہیں کے مجمع میں کے لوگوں نے مار مار کر اسی جگہ اس طرح ہلاک کر دیا تھا کہ اس کے جسم کی کوئی بڑی ہڈی سلامت نہیں رہی تھی۔ اس بارے میں طرح طرح کی خبریں آتی رہتی تھیں، اور اخبارات ایک سازش کے بارے میں خبریں شائع کرتے رہتے تھے۔ لیاقت علی خان کے بعد غلام محمد، اور پھر خواجہ ناظم الدین آئے جس کے بعد مشرقی پاکستان میں اردو زبان کے مسئلہ کا ہنگامہ ہوگیا۔ ساتھ ہی ساتھ کشمیر کا ہنگامہ چل رہا تھا۔ غرض اس قدر تیزی سے حالات میں تبدیلی آرہی تھی کہ ان تمام واقعوں سے راولپنڈی میں حالات پرسکون نہیں تھے۔

اس وقت تک ہمارے دو لڑکے ہو چکے تھے اور ہماری گود لی ہوئی بیٹی یعنی ہمارے شوہر کی بھتیجی تسنیم بھی ہمارے ساتھ رہتی تھیں۔ گھر میں ایک اردلی اور ایک خانساماں بھی رہتے تھے، اور اتنے عرصے میں ہمارے شوہر کے بھانجے سبطِ محمد راولپنڈی آگئے اور وہ ہمارے ساتھ رہنے لگے تھے۔ سبطِ فوج کے انجنیئرنگ کے محکمے (M.E.S.) میں شامل ہو گئے تھے۔ ہمارے شوہر ذاکر صاحب لیاقت علی خان کے واقعہ کی چھان بین میں حصہ لے رہے تھے۔ غرض ابھی ایک ہی مہینہ ہوا تھا ہمیں راولپنڈی میں کہ عید کا دن قریب آگیا۔ سخت گرمیوں کے دن تھے، یہ جون کا مہینہ تھا۔ لوگوں کے گھروں میں پانی بھی نہیں آرہا تھا کیونکہ کنٹونمنٹ میں پانی کی بہت کمی تھی، اور یہاں کی آبادی بہت تیزی سے بڑھی تھی۔ ہمارے شوہر پانی کے بھی ذمّہ دار تھے، لیکن یہ کام ان کی ذمّہ داریوں کا کم حصہ تھا۔ عید سے دو دن پہلے، رات کے وقت ذاکر صاحب کے دفتر سے بلاوا آگیا، اور اس بلاوے کے انداز سے ہمیں اندازہ ہوگیا کہ یہ بلاوا پانی کے سلسلے میں نہیں تھا۔ ہم انتظار کرتے رہے اور صبح ہوگئی، ذاکر صاحب کا پتہ نہیں تھا۔ پھر اسی طرح دو دن اور گزر گئے۔ ہم نے سبطِ محمد کو پتہ کرنے کے لئے کہا جو خود بھی فوج میں تھے، لیکن ان کو بھی صرف یہ بتایا گیا کہ ذاکر صاحب مصروف ہیں اور بس اس کے علاوہ کوئی اور بات نہیں بتائی گئی۔ عید کے تین دن بعد ذاکر صاحب گھر واپس آئے اور انہوں نے کچھ نہیں بتایا کہ کیا ہوا تھا۔ اس دن کے بعد سے ہم نے دیکھا کہ ان کی مصروفیت بہت بڑھ گئی تھی، اور ساتھ ہی ساتھ گھر میں بھی ان کا دھیان کہیں اور ہوتا تھا۔

اس کے چند ماہ بعد فوج کا ایک ٹرانسپورٹ ہوائی جہاز چکلالہ ایئرپورٹ سے پرواز کرتے ہی

زمیں بوس ہوگیا، اور جل کر بالکل تباہ ہوگیا۔تمام مسافر اور ہواباز بھی ہلاک ہو گئے۔اس واقعہ کے بعد ہمارے شوہر کافی عرصہ بہت بے چین رہے اور رات کو اُٹھ کر ٹہلنے لگتے تھے۔ایک مرتبہ ایک اور افسر سے گفتگو کے دوران ہمارے سننے میں یہ الفاظ آئے تھے کہ ''یہ کیسے ہوگیا، اب تو سارے ثبوت ختم ہو گئے''۔ ہم بھی پریشان ہونے لگے، لیکن انہوں نے پھر بھی کچھ نہ بتایا۔البتہ فوج چھوڑنے کے تقریباً دس سال کے بعد انہوں نے صرف تھوڑی سی بات بتائی، جو کچھ اس طرح تھی:

راولپنڈی کے قریب نتھیا گلی کے رہنے والے ایک نوجوان آدمی نے فوج کے ایک دفتر میں آکر فوج سے درخواست کی تھی کہ اس کو گرفتار کرلیا جائے۔ بنیادی طور پر اس کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔اس نوجوان کے مطابق اس کے پاس کچھ کاغذات اور خطوط ایسے تھے جو لیاقت علی خان کے قتل کی سازش میں شامل لوگوں کی نشاندہی کرتے تھے۔اس کمانڈ کے فوجیوں نے اسے فوراً اپنی حفاظت میں لے لیا اور پھر اس نوجوان کی بتائی ہوئی جگہ سے وہ کاغذات برآمد کر کے اپنی حفاظت میں رکھ لئے تھے۔ہمارے شوہر عید سے کچھ دنوں قبل انہی کاغذات کی اور اس معاملہ کی تحقیقات کے سلسلے میں مصروف رہے تھے۔اس تباہ ہونے والے جہاز میں کچھ افسران یہ کاغذات لے کر کراچی جا رہے تھے جو اس وقت پاکستان کا دارالخلافہ تھا۔اب اس زمانے میں فوٹو کاپی وغیرہ تو ہوتی نہیں تھی، بس اصلی کاغذ گیا تو سب گیا۔ وہ نوجوان بھی فوج کے ایک دوسرے محکمے کے حوالے کر دیا گیا تھا اور بعد میں وہ محکمہ یہ ماننے سے انکاری ہوگیا تھا کہ وہ نوجوان ان کے حوالے کیا گیا تھا۔ غرض اب تک یہ بات مسلّم نہیں ہوسکی ہے کہ لیاقت علی خان کو صرف سیّد اکبر نے شہید کیا تھا یا اس کے پیچھے کوئی اور بڑی سازش تھی۔ لی ہاروی آسوالڈ نے نومبر ۱۹۶۳ء میں امریکی صدر جان کینیڈی کو قتل کیا۔ لی ہاروی کو ایک اور شخص جیک روبی نے قتل کر دیا۔اب تک امریکی پوچھتے ہیں کہ لی ہاروی اکیلا قاتل تھا یا یہ کسی گروہ کا ہرکارا تھا۔ہمیں لی ہاروی اور سیّد اکبر میں بہت مماثلت نظر آتی ہے۔

ان تیزی سے بدلتے ہوئے حالات اور عام لوگوں میں ہر طرح کی پریشانی، بجلی پانی سے لے کر کھانے پینے کی چیزوں پر راشن، سب ہی کچھ تنگی پیدا کرنے کے عناصر تھے۔ایک روز برابر والے بنگلے سے کسی کے بڑے لحن کے ساتھ اشعار پڑھنے کی آواز آئی تو ہمارے شوہر نے ہم سے کہا، ''لگتا ہے جیلانی صاحب کے جانے کے بعد کوئی آپ کی پسند کے بھائی آ گئے ہیں''۔ہم نے کہا، ''مکان تو آپ ہی الاٹ کرتے ہیں، آپ

بتائیں کہ یہ کون ہیں اور انہیں یہ گھر کیسے مل گیا''۔ کہنے لگے، ''ہم نے تو یہ گھر ضمیر جعفری کو الاٹ کیا تھا، لیکن وہ دیکھنے میں تو شاعر نہیں لگتے تھے''۔ اب ان حالات میں کون کہتا کہ وہ شاعر بھی ہے، کیونکہ سب کو اپنے روزگار سے پیار تھا۔

پنڈی میں مشاعرے بھی ہوتے تھے۔ لیکن یہاں مشاعرے زبردستی کے لگتے تھے کہ جب دل ڈوبے ہوئے ہوں، زباں جو کہنا چاہتی ہے کہہ نہ سکے یا کہے تو سزا ملے، کیونکہ غلام محمد اور ان کے بعد کے کئی سال پاکستانیوں کی آزادئ تقریر بالکل مختصر رہی تھی۔ پھر رامپور کی نوابی طاقت تو تھی نہیں ان مشاعروں کی پشت پر۔ ہم نے ایک مشاعرے میں حصہ لیا، لیکن منتظم کی حیثیت سے۔ شعراء میں زہرہ نگار واحد خاتون شاعرہ تھیں، اور باقی سارے مرد تھے۔ ان میں شوکت تھانوی کو ہم نے پہلی مرتبہ دیکھا اور سنا۔ ہماری شاعری بھی جاری رہی اور کچھ شاعری کے کلام پنڈی کے ہفتہ وار رسالہ ''آزاد کشمیر'' میں شائع ہوتے رہے تھے۔

جہاں مشاعرے کمزور تھے وہاں میلہ اور مینا بازار لگتا تو بہت کامیاب ہوتا۔ لوگ فطرتاً زندہ دل تھے۔ انہی حالات میں فوج کی طرف سے ریڈکراس کے لئے ایک مینا بازار منعقد ہوا۔ تمام افسران کی بیگمات کے نام ایک اسٹال لگانے کی ذمّہ داری تھی۔ قرعہ نکلے اور مختلف اشیاء کے اسٹال خواتین کو ملتے رہے۔ شومئ قسمت کہ ہمارے نام کا قرعہ کافی آخر میں نکلا اور اس وقت تک تمام پسندیدہ اشیاء کے اسٹال نکل چکے تھے۔ مینا بازار کے ایک منتظم اور فوج کے ویٹرینری کور کے میجر ڈاکٹر احمد صاحب اور ایک ایجوکیشن کور کے کیپٹن عالم نے ہمیں مشورہ دیا کہ ہم مختلف ٹافیوں اور پان کا اسٹال لگالیں۔ اب پنڈی میں پان کھانے والا کون۔ ہم پُر امید نہیں تھے، لیکن پھر بھی اردلی کو ساتھ لے کر راجہ بازار سے سامان لے آئے۔ دوپہر سے ہی اسٹال لگالیا۔ اب سجایا کاہے سے جائے کیونکہ جب آمدنی کی امید نہ ہو تو پیسہ لگانے کی کیا ضرورت۔ اس سے پہلے رامپور کی ایک نمائش میں ایک مسز نندا کو پوریاں، کچوریاں اور دہی بڑوں کے اسٹال پر دیکھا تھا، اور ہمارے ذہن میں یہی خیال تھا کہ خواتین کے مجمع میں یہی چیزیں زیادہ بکیں گی۔ ہم نے پھر بھی محنت کی کہ کم پیسوں میں اسٹال عمدہ سا سجایا اور رامپور سے لائے ہوئے چمکدار نقش و نگار والے پاندانوں کو سامنے رکھا، اس طرح کہ یہ اسٹال پان کی دوکان لگنے لگا۔ جب لوگ آنا شروع ہوئے تو ہمارے اسٹال پر مجمع بڑھنا شروع ہوگیا۔ لوگوں کو پان کے بارے میں زیادہ روشناسی نہیں تھی اور سب جاننا چاہتے تھے کہ یہ چیز کیا ہے۔ ہم نے بھی ۴ر آنہ کا پان اس نیلامی

میں پہلے ایک روپیہ، پھر دو، اور پھر پانچ روپیہ تک میں دیا۔ رات کے گیارہ بجے تک ہم اس میں لگے رہے اور پھر پیسے گنتے رہے۔ اس مینا بازار میں ہمارے اسٹال نے سب سے زیادہ پیسہ جمع کر کے ریڈ کراس کو دیا تھا۔ بعد میں کئی روز تک رگڑ رگڑ کر ہاتھ دھونے کے باوجود بھی ہاتھوں سے کتھے کے نشانات نہیں گئے۔ پنڈی میں ہماری رہائش کے دوران یہ اِس قسم کی سب سے اعلیٰ پیمانے کی تقریب تھی۔

ہماری دوسری کامیابی ایک بے بی شو میں ہوئی۔ اس زمانے میں پنڈی میں انگریزی راج کا ابھی بھی اثر تھا۔ ہر چیز انگلستانی انداز میں منائی جاتی، سو یہ بے بی شو بھی ایسا ہی تھا۔ اس بے بی شو میں ہم نے اپنے بڑے لڑکے کو پیش کیا اور انعام حاصل کیا۔ اسی طرح خود کو مصروف رکھنے کی کوشش جاری تھی کہ شوہر کا زیادہ وقت راولہ کوٹ میں گزرتا تھا۔ پھر بیگم رعنا لیاقت علی خان کی شروع کردہ پاکستان وومنز نیشنل گارڈ میں شمولیت لے لی، اور وہاں رائفل سے نشانہ بازی کی تربیت لی۔ یہاں بالکل فوجیوں والی تربیت ہوتی تھی، اور اسی طرح وردی بھی فوجیوں کے جیسی ہوتی تھی۔ ہاکی اور اتھلیٹکس میں بھی حصہ لیا۔ اسی زمانے میں ہمارے شوہر نے ہمارے لئے ایک باکسنگ کے مقابلہ میں بالکل اگلی صف میں نشست کا انتظام کیا۔ ابھی پہلا راؤنڈ ختم ہو کے دوسرا شروع ہوا ہی تھا کہ مقابلہ میں جوش بڑھ گیا۔ ہم فوراً باہر آ گئے کہ یہ کیسا کھیل ہے، بلاوجہ ہی بچارے کو مار مار کے ڈھیر کر دیا۔ لیکن ہمارے شوہر نے ہمیں پھر منا لیا اور ہم نے پھر اندر جا کر یہ مقابلہ پورا دیکھا، کچھ آنکھیں کھول کر اور کچھ آنکھیں بند کر کے۔ ساتھ ہی ہمارے پانچ سالہ بیٹے نجمی بیٹھے ہوئے ان باکسروں کو ہدایات دیتے رہے کہ ''زور سے مارو، اُٹھنے مت دو''، وغیرہ وغیرہ۔ اس سے یہ ہوا کہ ہمیں پورے مقابلے کی خبر رہی۔ اس کے بعد ہم نجمی کو لے کر کئی اور مقابلے دیکھنے گئے۔

ہم پاکستان وومنز نیشنل گارڈ کے لباس میں۔

ان دنوں راولپنڈی میں چین کا ایک وفد آیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے جواہر لال نہرو نے

پنج شیل معاہدہ کے بعد دہلی میں چینی ہندوستانی بھائی بھائی کے نعرے لگوائے تھے اور چو این لائی بھی ہندوستان کا دورہ کرنے والے تھے۔ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے پاکستان چاہتا تھا کہ چین سے دوستی مضبوط کرے۔اس لئے اس وفد کی آمد بہت اہم تھی۔ گہری فوجی باتیں تو شاید ہمارے شوہر کو معلوم ہوں، اور سیاسی باتیں تو ان کو بھی پتہ نہ ہونگی، لیکن ہمارے ذمّہ یہ سب کچھ نہ تھا۔ راولپنڈی میں آک لک سوئمنگ پول پر ان لوگوں کو شام کی چائے پر مدعو کیا گیا تھا۔ یہ دعوت فوجی افسروں کی طرف سے تھی، اور ذاکر صاحب اسٹیشن آفیسر ہونے کی حیثیت سے اس کے انتظام کے سربراہ تھے۔ ہم اور ہمارے ساتھ بیگم جنرل ناصر، بیگم جنرل حامد اور دوسرے افسران کی بیگمات، چینی وفد کی بیگمات کی میزبانی کے لئے منتظم تھے۔ اِس موقعہ پر وہاں جنرل شیر علی بھی آئے تھے۔ہمیں ایک مترجم صاحب ملے تھے۔ پارٹی تو دلچسپ رہی، گو گفتگو کم ہی ہوسکی کیونکہ ایک مترجم کِس کِس کی باتوں کا ترجمہ کرتا پھرتا۔اب اگر دیکھیں کہ چین اور پاکستان کی دوستی کتنی پختہ ہے، تو اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ پارٹی کامیاب ہی رہی ہوگی۔

راولپنڈی ۱۹۵۳ء : ذاکر حسین اور ہم، راولپنڈی کلب میں۔

ہمیں ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا پنڈی میں کہ یعقوب صاحب کو، جنہیں ہم کوہاٹ سے جانتے تھے،

خبر ہوگئی کہ ہم اب یہاں آ گئے تھے۔ایک دن یہ ہمارے بنگلے پر آ گئے اور آتے ہی شکوے شکائتیں کرنے لگے۔ غرض بقر عید کا بلاوہ دے گئے، اور یہ اگست ۱۹۵۲ء کا زمانہ تھا۔ بقر عید مہینہ کے آخر میں تھی۔ ہم کوہاٹ پہنچے تو وہاں دنبے ذبح ہو رہے تھے۔ یہ دنبے یعقوب صاحب اور ان کے بھائیوں نے خود ذبح کئے تھے۔ چربی الگ کی گئی اور پھر اس چربی سے بنائے ہوئے پراٹھے ہمیں کھلانے پر اصرار ہوتا رہا، مگر ہم انہیں سونگھ کر ہی سیر ہو گئے تھے۔ ہر روز یہی ہوا۔ ان کی عورتوں کو اردو بالکل نہیں آتی تھی، بس اشاروں سے گفتگو ہوتی اور خوب ہوتی تھی۔کوہاٹ کی دوپہر بھی سخت اور راتیں بھی۔ دن میں چٹائیاں پانی میں بھگو کر پلنگ پر بچھائی جاتیں، اوپر سے چادریں بچھائی جاتیں تھیں۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ ہمیں یہاں پان مل جائے اور بیگم یعقوب نے بازاروں میں بہت تلاش کروایا، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ ہم نے سونف پر گزارا کیا جو ہم احتیاطاً اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ سونف پان کھانے والوں کے دماغ کی توجہ بٹائے رکھنے میں اسی طرح کام آتی ہے جس طرح چیونگ گم سگریٹ سے علیحدہ ہوئے آدمیوں کے کام آتی ہے۔ یعقوب خان کے خاندان کے ساتھ ہم کوہاٹ میں آٹھ دن رہے اور پھر پنڈی واپس آ گئے۔

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے اور ہم آہستہ آہستہ اس ماحول میں اپنائیت پانے لگے۔

بارہواں سفر ۔ پنڈی سے رامپور

انسان ہجرت کرنے کے بعد خود کو نئی جگہ بسانے کی کوشش میں رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ وہ نئی جگہ کا جزو بن جائے اور یہ نئی جگہ بھی اس کی سوچ کا ایک جزو بن جائے۔ نئی جگہ پر عموماً مہاجر محنت میں لگے رہتے ہیں اور اس وقت تک مصروف رہتے ہیں جب تک کہ ان میں اس نئی جگہ پر اپنی استحکامی پر اعتماد نہیں پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم نے یہ امریکہ میں بھی دیکھا جہاں ہماری اولاد اور ان کے دوستوں نے اپنی جگہیں بنانے کے بعد ہی اپنے رشتہ داروں کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اسی طرح ہم راولپنڈی میں کئی ماہ تک صرف خود کو وہاں کے ماحول میں ڈھالنے کی کوشش میں رہے۔ شوہر کے فوج میں عہدہ، اور مذہب اور زبان میں کوئی بڑی دشواری نہ ہونے کی وجہ سے اس کوشش میں بہت جلد ہی کامیابی حاصل ہو گئی۔ امریکہ میں ہم نے دیکھا کہ وہ پاکستانی جو بغیر تعلیم یہاں آئے وہ نقصان میں رہے، اور انہیں برسوں گزر گئے تکالیف میں رہتے ہوئے۔

ہم نے ہندوستان جا کر اپنی اماں اور ربّا سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ذاکر صاحب نے ہماری ہاں میں ہاں ملائی، گو فوج میں ہونے کی وجہ سے وہ خود نہیں جا سکتے تھے۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے اور حالات میں کافی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ ہندوستانی حکومت نے بہت سختی سے سکھوں اور ڈاکوؤں سے نمٹا تھا اور پاکستان نے بھی پنجاب میں سخت اقدامات کئے تھے۔ اب ریل کے سفر میں خطرہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہی دیکھ کر ہم نے ریل کا ٹکٹ لے کر لاہور کی طرف روانگی اختیار کی۔ لاہور پہنچے تو پہلی مرتبہ واہگہ بارڈر پر پاکستان کی چوکی دیکھی۔ جاتے وقت اتنی پریشانی نہیں ہوئی۔ رامپور پہنچ کر سب سے خوب خوب گلے ملے اور روزآنہ گھر میں دعوت

ہوئی۔ ان چند ہی سالوں میں رامپور بدل گیا تھا۔ ڈولیاں ختم ہو چکی تھیں اور ہر جگہ سائیکل رکشہ چل رہے تھے جن پر اچھا سا پردہ ہوتا، یا وہ کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ ہم ویسے راولپنڈی میں تو پردہ نہیں کرتے تھے، لیکن رامپور میں آنے سے پہلے برقعہ کا انتظام کر کے چلے تھے۔ کچھ والدین کا احترام اور بزرگوں کی عزت کا خیال تھا اور کچھ ہمت بھی نہیں پڑتی تھی کہ رامپور میں بغیر پردہ کے باہر نکلیں۔

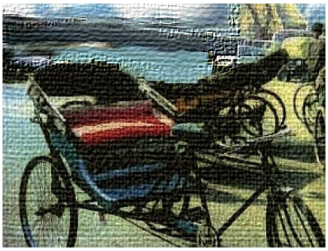

رامپور کے رکشے، دور گئے دن ڈولیوں کے

رامپور میں رہنے کے دوران ہم موقعہ مناسب دیکھ کر اپنے دونوں لڑکوں کی مسلمانی کے فرض سے بھی برانداز ہو گئے۔ راولپنڈی میں شوہر کی مستقل راولہ کوٹ میں رہنے کی وجہ سے یہی زیادہ مناسب تھا۔ بس فوج کی زندگی پورے خاندان پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسی طرح دو مہینے گزر گئے اور ہم نے واپسی کا ارادہ کیا۔ ہمارے ببّا نے ریل کے ٹکٹ خریدے اور ہمیں دہلی تک چھوڑنے آئے۔ راستے بھر نصیحتیں کرتے رہے کہ سفر کے دوران زیور نہیں پہننا چاہیئے، پرس مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے، اور بچوں کے اوپر مستقل کڑی نگاہ رکھنا اہم ہے۔ حالات سے سب ہی پریشان تھے، اور ہمارے اکیلے سفر کی وجہ سے ببّا مزید فکرمند تھے۔ پلیٹ فارم پر ہمارے والد صاحب کے ایک خاندانی واقف کار خاندان کے کچھ افراد مل گئے۔ کچھ خواتین تھیں اور ایک صاحب۔ یہ پاکستان ہجرت کر رہے تھے۔ ان سے ہمیں ملوا کر ببا کی طبیعت ہلکی ہوئی۔ اب بیچ میں پلیٹ فارم تھا اور اس کے ایک طرف ہماری ٹرین تھی اور دوسری طرف رامپور کی۔ ببّا نے ہمیں ہماری ٹرین پر بٹھا کر ہمیں خدا حافظ کہا اور اپنی میں بیٹھ گئے۔ ان کی ٹرین پہلے روانہ ہو گئی۔

ہم نے آس پاس نظر ڈالی تو دیکھا کہ یہ لوگ ساری جگہیں گھیرے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سامان بھی بہت زیادہ تھا اور بکھرا ہوا پڑا تھا۔ ان خواتین نے ہمارا خیال رکھا اور ہمیں بیٹھنے کی جگہ دی۔ ہم نے بچوں کو آرام سے لٹایا اور بات چیت شروع کی۔ ساری عورتیں گوٹے لچکے کے کپڑوں میں ملبوس تھیں اور زیورات بھی خاصے پہنے ہوئے تھے۔ امرتسر پہنچے اور قلی اندر آئے۔ پوچھنے لگے کہ کون سا سامان کس کا ہے۔ یہ قلی کسی حد تک یہ انتظام بھی کرتے تھے کہ کسٹمز کے وقت سب کو آسانی ہو اور مسافروں کا سامان ایک دوسرے

کے سامان سے الگ الگ رہے۔ ہمارے پاس سامان زیادہ نہیں تھا لیکن ہم چار آدمی تھے۔قلیوں نے ہم سے پوچھا تو ہم نے صرف اپنا سامان انہیں دکھا دیا۔ ان لوگوں کے پاس سامان زیادہ تھا جس سے کسٹمز پر کچھ دشواری ممکن تھی۔ غالباً اسی لئے ان میں سے ایک خاتون کہنے لگیں کے ہم سب ساتھ ہی ہیں۔ یہ سننے کے بعد قلی کچھ حیل وحجّت کرنے لگے اور کہنے لگے کہ'' دیکھیں بیگم صاحب، ان لوگوں کی تلاشی بہت لمبی ہوگی اور یہ شام سے پہلے فارغ نہیں ہونگی۔ اب آپ خود بولو''۔شام کا مطلب تھا کہ لاہور کی ٹرین نکل جاتی۔ہم نے ان سے معذرت کی کہ ہمارے ساتھ تین بچے تھے، اور ہم قلی کو لے کر اپنا سامان آدھے گھنٹے میں کسٹمز سے چھڑا کر پاکستان کی ٹرین کی طرف چلے۔اس کے لئے کافی دور پیدل چلنا ہوتا تھا اور قلی یہ سامان سر پر اٹھا کر چلتے تھے۔ اس کٹھن کام کے یہ لوگ ۱۰ر سے ۱۵ر روپے لے کر خوش ہو جاتے تھے اور ایک دن میں ان کو بمشکل ایک یا دو سواریاں ملتی تھیں۔ جب ہم ہندوستانی کسٹمز سے نکل رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ان شریف لوگوں کا سامان ہر طرف بکھرا پڑا تھا اور کسٹمز والے بھی اس پر اِس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے جیسے دریا میں مگر مچھ اپنے شکار پر۔ یہ دیکھ کر ہمیں دہلی کے پالم ایئر پورٹ کا کسٹمز آفیسر یاد آ گیا جس نے ہمارے زیورات اڑا لئے تھے۔ اب اس وقت یہ خاندان پاکستان ہجرت کر رہا تھا اور یہ کسٹم افسران اِن لوگوں کے سامان پر ڈاکہ ڈال رہے تھے اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے ہم پاکستانی حصہ میں پہنچے اور لاہور کی ٹرین لی۔ پھر لاہور سے راولپنڈی کی ٹرین لی جہاں اسٹیشن پر ہمارے شوہر پہلے ہی سے موجود تھے۔

پنڈی پہنچنے کے بعد اب فرض ہوا کہ بیٹی تسنیم اور بڑے لڑکے نجم کو اسکول میں داخل کیا جائے۔ دوسرے تمام افسران کے بچے راولپنڈی کے عیسائی اسکولوں میں جاتے تھے کیونکہ انگریز کی بادشاہی ابھی تک دماغوں پر تازہ تھی۔ دوسرے پاکستان میں معیاری اسکول صحیح معنوں میں ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے۔ ہم نے بھی اپنے دونوں بچوں کو لال کرتی کے علاقے میں واقع پریسنٹیشن کانونٹ اسکول میں داخل کرا دیا۔ اُس اِسکول میں تسنیم نے پیانو بجانے کی تربیت لینا شروع کی تو ہمیں سارنگی اور ستار نوازی بہت یاد آئی۔

چھوٹے سفر ۔ پنڈی سے مری، بار بار

پنڈی میں اس وقت گرمی سے بچنے کا صرف ایک حل تھا، اور وہ تھا'' مری چلو''۔ شوہرِ نامدار ذاکر صاحب تو راولہ کوٹ میں زیادہ وقت لگاتے تھے اور وہاں غالباً موسم نسبتاً قابلِ برداشت ہوتا ہوگا۔لیکن یہاں

کیا تھا۔کوئی سنیما ہال بھی ایئر کنڈیشنڈ نہیں تھا جو آپ دن میں ایک فلم دیکھ کر کچھ وقت ٹھنڈ میں گزاریں۔ رامپور میں تو برف کی سلیں بھی مل جاتی تھیں، یہاں پانی بھی نہیں ملتا تھا۔بس مری ہی ایک سوغات تھی۔

ہر ماہ دو ماہ کچھ پڑوسی اور جان پہچان والے کچھ خاندان جمع ہو کر پنڈی سے مری جاتے۔ سفر تو بسوں میں ہی ہوتا، لیکن ایک اپنا گروہ یا حلقہ ساتھ ہونے سے پورا راستہ طنز و مزاح کے ساتھ گزرتا۔ مری کے راستے میں سٹیلائٹ ٹاؤن میں پیاز کے ایک آڑھتی نے ایک پیازی رنگ کا بڑا سا گھر بنایا تھا جس کا نام بھی اس نے ''پیازی محل'' رکھا تھا۔ سب اسے دیکھ کر کہتے کہ ''ہم لوگوں سے زیادہ تو یہ بندہ ہوشیار ہے کہ پیاز بیچتا ہے، اور روپوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔ ہم بھی پیاز بیچتے تو ایسا گھر بنوا لیتے''۔ غالباً اُن کی ملاقات ہمارے سبزی والے سے نہیں ہوئی تھی۔

اسی طرح کے ایک سفر میں پنڈی کی گرمی سے بچنے کے لئے طے ہوا کہ چلو مری چلیں۔ بس تین گاڑیاں پکڑیں اور چلے مری۔ یہ گاڑیاں بھی اچھی مضبوط ہوتی تھیں، پوری فولاد کی۔ آجکل کی کاریں کافی نرم دھات کی ہوتی ہیں اور اب تو پلاسٹک کی بھی ہوتی ہیں، لیکن یہ گاڑیاں اندر بیٹھنے والوں میں اعتماد پیدا کرتی تھیں۔ اب راستے میں ہر طرف گرمی سے سوکھے ہوئے درخت اور سوکھی پہاڑیاں نظر آئیں تو ایک صاحب بولے، ''ارے یہ پہاڑیاں کیا کلین شیوٗ ہوگئی ہیں!'' واقعی ایسا لگتا تھا جیسے کہ کسی نے استرے سے ساری پہاڑیاں گنجی کردی ہوں۔ یہاں کیلیفورنیا میں ہمارے گھر کے پچھلے حصّے میں گھر کے اندر تقریباً ایک ایکڑ پر ایک پہاڑی ہے اور ہم ہر سال گرمیوں میں اس کو کلین شیوٗ کرواتے ہیں کیونکہ یہاں کے آگ سے دفاعی ادارے نے یہ ایک قانون بنایا ہے جسے پورا کرنا لازمی ہے۔ لیکن مری میں دراصل لکڑی کے لئے درختوں کی کٹائی اسی وقت شروع ہوگئی تھی اور کئی علاقوں میں پہاڑیاں کلین شیوٗ ہوگئی تھیں۔

مری پہنچے تو سخت سردی تھی جو کہ نئی بات نہ تھی۔ پھر بھی ہم نے اپنے بھاری لبادے اور شال گاڑی میں چھوڑی، اور طے یہ کیا کہ پنڈی پوائنٹ پر کھانا کھایا جائے۔ خیال یہ تھا کہ اتنا چلنے کی وجہ سے جسم میں گرمی آئے گی اور ان جرسیوں کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب وہاں پہنچنے میں تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور سب نے خوشی سے کھانا کھایا۔ کھانا کے بعد جب خون نے معدہ کا رخ کیا تو سب کا سردی کے مارے برا حال۔ اب کسی سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ سب کپکپاتے اور لرزتے ہوئے جلدی جلدی نیچے آئے اور بازار سے گرم گرم چائے

کی تلاش ہوئی ۔ کچھ ہی دور چلے تھے کہ ایک فرشتہ سڑک کے کنارے بیٹھا ہوا ملا جو ایک بڑے سے سماور میں سے چائے بیچ رہا تھا۔اس سے سب نے چائے لی ۔لیکن نیکیاں کام نہ آئیں اور فرشتہ نے پیسے ہی لئے ، عام دِنوں سے بھی دُ گنے ۔گرم گرم چائے پی تو جان میں جان آئی اور یاد آیا کہ قریب ہی مری کالج تھا جس میں ہماری ایک ملنے والی مسز کیپٹن عمر کی ڈالی نامی ایک صاحبزادی بھی پڑھتی تھیں ۔مسز عمر رامپور میں مسز آغا کے نام سے پہچانی جاتی تھیں اور یہ ہمارے ببّا کے واقف کار آغا صاحب کی بیٹی تھیں ۔ڈالی عمر میں ہم سے کافی قریب تھیں ۔ہم بھی اب ۲۳ / سال کے ہو چلے تھے ۔جلدی جلدی ان سے ملنے گئے ، اور اسی طرح بس وقت تیزی سے نکل گیا اور شام ہو چلی ۔واپسی کا ارادہ ہوا ، اور پنڈی تک پہنچتے پہنچتے رات ہوگئی تھی ۔موسم اب نسبتاً اتنا گرم نہیں تھا ۔